R. No, 2186/57 Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

D.
I-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 4/-
Per Copy -/12 P

جلد ۲۵ - شمارہ ۴۱ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | یکم نومبر ۱۹۶۶ء

اداریہ

قوم کا فرض

یہ زمانہ تعلیمی اداروں میں سندیں دینے کے جلسے کرنے اور خطبے پڑھنے کا ہے۔ عام طور پر ان خطبوں میں بات جوش سے ہوتی ہے اور نوخیزوں کو تلقین، تنبیہ، تادیب، سبھی سننی پڑتی ہے۔ قوم کی تاریخ، اس کی تہذیب کی عظمت، اخلاق کا نصب العین، سماج کی صحت کے اصول، تعلیم کے مسائل شرح و بسط سے بیان کیے جاتے ہیں۔ نوجوانوں کو ان کی بدنظمی اور غیر ذمہ داری پر فہمائش کی جاتی ہے اور خلاصۂ فریاد کے طور پر سب سے قوم پر قربان ہو جانے کی فرمائش ہوتی ہے۔ اس لیے عام طور پر ان خطبوں کا کوئی گہرا اثر نہیں ہوتا۔ لیکن حال میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر ایس ملگاؤکر ایڈیٹر ہندوستان ٹائمس نے جو خطبہ پڑھا وہ اپنی دلسوزی، حقیقت پسندی اور معنویت کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس قابل ہے کہ اس پر غور کیا جائے اور اگر اس کے نتائج سے اتفاق ہے تو اس سلسلے میں کوئی عملی قدم جلد سے جلد اٹھایا جائے۔ عملی قدم کے معنی انتظامی کارروائی کے نہیں بلکہ مرض کے علاج کے ہیں۔

فاضل مقرر نے کہا کہ قوم کے سامنے یہ مسئلہ نہیں ہے کہ ہر تبدیلی کو روکا جائے بلکہ ان تبدیلیوں سے ایسا کام لیا جائے کہ سماج میں نئی جان آ سکے اور عدل و مساوات پر مبنی سماج کی تعمیر ہو سکے۔

انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ آج قوم کا جو مزاج ہے اس سے نوجوان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ مزاج سوکھے تنکے کی طرح حالات کے بہاؤ پر بہنے، ناکامی، بددلی، ہنگامے اور کشاکش کا ہے۔ اس وقت ہماری کوئی واضح قومی سمت اور رفتار نہیں ہے۔ جن آدرشوں کی بنا پر ہمارے رہنماؤں نے آزادی حاصل کی تھی وہ کمزور ہو چکے ہیں اور اب مہذب سماجی تنظیم پر بھی اس مرض کا اثر ہونے لگا ہے۔ آزادی کے بعد ہم نے کچھ کامیابی حاصل کی ہے مگر ہمارے اخلاقی معیاروں پر زوال آ گیا ہے۔ بدعنوانیاں، خصوصاً اقربا پروری عام ہیں، ذاتی مفاد کے لیے لوگ دھڑلے سے سیاسی طاقت استعمال کرتے ہیں۔ مختلف طاقت ور گروہوں نے انتظامیہ کو اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے۔ مراعات اور امتیازات حاصل کرنے کے لیے دوڑ ہو رہی ہے۔ کاروباری حلقہ ٹیکس دینے سے بچتا ہے اور حکومت کی مشینری کی نااہلی اور ناقابلیت کی مظہر ہے۔ غذا کے لیے بیرونی ملکوں پر تکیہ کرنے کی وجہ سے قوم کا اپنے پر سے اعتماد رخصت ہو رہا ہے اور قومی کردار بھیک کا عادی ہونے کی وجہ سے مجروح ہو رہا ہے۔ حکومت میں جتھے بندی ہے اور وہ چونکہ کوئی اخلاقی بنیاد نہیں رکھتی اس لیے وہ آگے کی نہیں سوچتی اور ہر معاملے میں فوری کارروائی کو کافی سمجھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں بہت سی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ ہم وقت کے کئی دوروں میں ایک ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر ہر تبدیلی کو ترقی کے نام پر سراہا نہیں جا سکتا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ہماری رہنمائی ایسے ہاتھوں میں ہو جو تبدیلیوں کی معنویت کو سمجھیں اور جدید و قدیم میں کوئی معنی خیز رشتہ قائم کر سکیں، جو رہنمائی کر سکیں، عوامی جذبات و تعصبات کے آلۂ کار نہ ہوں۔ آج صورت یہ ہے کہ بہترین دماغ قوم کی رہنمائی کے لیے میسر نہیں آتے کیونکہ امیدوار صلاحیت کی بنا پر نہیں بلکہ علاقائی، فرقہ وارانہ یا ذات پات کے خیال سے چنے جاتے ہیں یا یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ انتخابات کا خرچ برداشت کر سکتے ہیں یا نہیں یا ان کے سرپرست چوٹی کے لوگوں میں کتنے ہیں۔ کانگریس میں اختلافات کسی اصول کی بنا پر نہیں ہیں۔ جب کوئی لیڈر ہٹ جاتا ہے تو وہ حکومت کی خرابیاں بڑے زور شور سے بیان کرنے لگتا ہے۔ مخالف پارٹیوں میں ابن الوقتی ہے۔ سب پارٹیوں پر شبہ کیا جاتا ہے کہ انھیں سرمایہ دار یا بیرونی طاقتیں امداد دیتی ہیں۔ پارلیمنٹ میں حال میں جو مظاہرے ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہو گیا ہے کہ وہاں کی بحثوں کا کیا معیار ہے۔ آئندہ الیکشن کے موقع پر اس سے زیادہ پستی کا مظاہرہ ہوگا اور پھر بھی ہم اس پر تعجب کرتے ہیں کہ ہمارے نوجوانوں کو کیا ہو گیا ہے۔

شری ملگاؤکر نے یہ بات بڑے پتے کی کہی ہے۔ دراصل نوجوان سماج کے سب سے سریع الحس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ سماج کی ان خرابیوں پر بڑے کڑھتے ہیں یا رو پیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر نوجوان آئے دن اخلاق، انصاف، پاکیزگی یا دیانت کا خون ہوتے دیکھ کر تمام اچھے معیاروں سے بدظن ہو جاتے ہیں اور چونکہ ان کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے اس لیے توڑ پھوڑ کی کارروائی کے ذریعہ سے اپنے دل کا بخار نکالتے ہیں۔ اس سلسلے

میں شری مل گاؤنکر نے اقلیتوں کے مسائل کی طرف بھی توجہ دلائی ہے انھوں نے تسلیم کیا ہے کہ قانون کے مطابق اقلیتوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی، مگر عمل میں ہوتی ہے اس لیے اقلیتوں کے تحفظ کا سوال ان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک شہری کی حیثیت سے جو ملک کی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا چاہتا ہے انھوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر آبادی کا دسواں حصہ قومی زندگی میں بھرپور حصہ نہیں لے سکتا تو اس سے پوری قومی زندگی پر اثر پڑتا ہے۔ اس وقت ہندوؤں میں ماضی پرستی بڑھ رہی ہے۔ اس کے رد عمل کے طور پر اقلیت میں بھی ماضی پرستی بڑھے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دستور کے مطابق ہم سیکولر ہوں گے مگر وہ قومی یک جہتی اور انسانی برادری جو سیکولر سماج کی روح ہے پیدا نہ ہوگی، اس لیے اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہم نہ صرف اپنے ملک میں سیکولر اسپرٹ رکھیں بلکہ ہمسایہ ملکوں سے بھی ہمارے دوستانہ تعلقات ہوں۔ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کی تلخی صرف ہندوستان کی وجہ سے نہیں ہے پاکستان بھی اس کا ذمہ دار ہے مگر بڑے بھائی کی حیثیت سے ہماری ذمے داری بھی بہت ہے اور اس لیے ہماری برابر یہ کوشش ہونی چاہیے کہ تاشقند کی روح کو سرد نہ ہونے دیں۔ اگر دونوں ملکوں میں تجارتی تعلقات اور بہتر ہو سکیں تو دونوں کا اس میں ہر طرح فائدہ ہے۔

شری مل گاؤنکر نے جو باتیں کہی ہیں وہ نئی نہیں ہیں، مگر جس طرح کہی ہیں اس سے خلوص کی بو آتی ہے اور اس لیے ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان سیکولرزم کا نام لے کر ترقی نہیں کر سکتا۔ سچے صحیح معنی میں سیکولر رہنا ہے۔ اسی طرح وہ جدید دور میں پرانی قدروں کو لے کر نہیں چل سکتا۔ اسے جدید و قدیم میں ایک توازن پیدا کرنا ہے اور جو چیزیں اسے آگے بڑھنے سے روکتی ہیں ان کو راستے سے ہٹانا ہے۔ مگر اسے اپنی تاریخ تہذیب اور صالح روایات کو لے کر چلنا ہے۔ اسے اقلیتوں کے ساتھ ان کی خاطر نہیں بلکہ ملک و قوم کی ترقی کی خاطر انصاف کرنا ہے۔ اسے ہمسایہ ملکوں سے دوستی بڑھانے کی تمام تدابیر اختیار کرنا ہیں اور اسے ایک ایسی اخلاقی بلندی اور ذہنی پاکیزگی کے سہارے آگے بڑھنا ہے، جو کہ وقت کے لیے نہ ہو بلکہ جس کو پوری زندگی میں عمل دخل ہو۔ اس کے لیے پورے قومی مزاج کو بدلنا پڑے گا۔

ادب کے لیے نوبل انعام

اسٹاک ہوم۔ ادب کے لیے ۱۹۶۶ء کا نوبل انعام آج مشترکہ طور پر دو یہودی مصنفوں کو دے دیا گیا۔ ان مصنفوں میں اسرائیل کے جناب سیموئیل جوزف اگنن اور جرمنی کے جناب نیلی ساچز شامل ہیں۔ سویڈن کی اکیڈمی نے یہ انعام جناب جوزف اگنن کی اس بیانیہ صلاحیت کی بنا پر دیا جو انھوں نے یہودی عوام کی زندگی کو اجاگر کرنے میں ظاہر کی۔ جناب ساچز کو انعام ان کی نظمیہ اور ڈرامائی تخلیقات پر دیا گیا ہے۔

قاضی عبدالستار کا ناولٹ شب گزیدہ شایع ہوگیا

علی گڑھ ۷ اکتوبر۔ ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے مشہور افسانہ نگار قاضی عبدالستار کا مشہور ناولٹ "شب گزیدہ" کتابی صورت میں شایع ہوگیا۔ یہ ناولٹ ادارہ انیس اردو الٰہ آباد نے بڑے اہتمام کے ساتھ شایع کیا ہے اور وہیں سے تین روپے پچہتر پیسے میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔ (نامہ نگار ہماری زبان)

برمنگھم میں ۱۵ ہزار اردو بولنے والے

لندن۔ ایک اندازہ کے مطابق برمنگھم میں اردو بولنے والوں کی تعداد تقریباً پندرہ ہزار ہے۔ رنگ دار لوگوں کے رابطہ افسر مسٹر ایلین گیبر اردو داں لوگوں کو معلومات بہم پہنچانے کے لیے ایک اردو ٹائپ رائٹر خرید رہے ہیں اور ٹائپ رائٹر بنگلش ٹائپ رائٹر کی طرز پر بنایا گیا ہے۔

اور اس قسم کا ایک ٹائپ رائٹر بریڈ فورڈ شمالی انگلستان میں بھی استعمال ہو رہا ہے اور جناب گیبر نے بتایا ہے کہ اس ٹائپ رائٹر کی مدد سے اردو کا ایک ہفتہ وار کالم ٹائپ کیا جائے گا اور جو بعد کو برمنگھم کے ایک اخبار میں چھپتا ہے موصوف نے کہا ہے کہ اردو داں لوگوں کو معلومات بہم پہنچانے کا عمل مہنگا اور پیچیدہ ہے۔ مترجم تو مل جاتے ہیں، لیکن ایسے لوگوں کی خدمات حاصل کرنا اور زیادہ مشکل ہے اور جو خوشخط ہوں اور اب تجربے کے طور پر اردو ٹائپ رائٹر استعمال کیا جائے گا۔ (قومی آواز)

برٹش میوزیم میں اکبر نامے کا قلمی نسخہ

برٹش میوزیم نے برصغیر کا ایک خوبصورت قلمی نسخہ حاصل کر لیا ہے پچھلے برسوں میں اسلامی فن مصوری کی جو اہم ترین دریافتیں ہوئی ہیں ان میں اسے بھی شمار کیا جا رہا ہے۔

یہ قلمی نسخہ اکبر نامہ کی ایک جلد ہے یہ شہنشاہ اکبر ۱۵۵۶ء-۱۶۰۵ء کے دور حکومت کی تاریخ ہے جو اس کے وزیر ابوالفضل ابن مبارک نے لکھی تھی۔ اس کے کاتب مشہور خطاط مولانا محمد کشمیری ہیں جنھیں "زریں رقم" کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ وہ نفیس تصاویر میں تین اصل جلدوں کی یہ جلد ہے۔ یہ تصویریں شاہی نگار خانے کے مصوروں نے بنائی ہیں جن میں سے بیشتر ہندو تھے لیکن ان میں ایرانی اثرات خاصے نمایاں ہیں۔

بقیہ دو جلدیں ڈبلن میں سر چیسٹر بیٹی کے ذخیرۂ نوادر میں موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قلمی نسخہ اس مال کا ایک حصہ ہے جو نادر شاہ افشار ۱۷۳۹ء میں دہلی سے لایا تھا۔ ۱۹۰۱ء تک اس کے بارے میں کسی کو علم نہ تھا۔

شہریار شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکچرر ہو گئے

علی گڑھ ۷ اکتوبر۔ ادبی حلقوں میں اس خبر کا خیر مقدم کیا جائے گا کہ اردو کے نوجوان شاعر شہریار کا تقرر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرر ہوگیا ہے۔ شہریار نے ۱۹۶۱ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ ایم۔ اے کیا تھا۔ ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ تیار ہو رہا ہے عنقریب یونیورسٹی کو پیش کیا جانے والا ہے۔ وہ تقریباً ڈیڑھ سال سے ادارہ "ہماری زبان" سے وابستہ تھے۔ (نامہ نگار ہماری زبان)

ڈاکٹر سید محمد عقیل

امانت کی اندر سبھا

اردو میں ڈرامہ نگاری پر جو کچھ کام ہوا ہے تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ بادشاہ حسین کی اردو میں ڈرامہ نگاری، نور الٰہی محمد عمر صاحبان کی ناٹک ساگر کے بعد ذرا سنجیدگی کے ساتھ اردو میں ڈراموں کی تحقیق پر کام شروع ہوا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی اور ڈاکٹر عبد العلیم نامی نے ڈراموں کی تحقیق اور ڈرامہ نگاری کی تاریخ پر اچھی خاصی کتابیں پیش کیں جو اردو کے ڈراموں پر کام کرنے والوں کے لیے آیندہ مشعل ہدایت کا کام کرتی رہیں گی۔ فن ڈرامہ نگاری سے متعلق بھی ایک کتاب اسلم قریشی صاحب کی پاکستان سے شایع ہوئی ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو کے قدیم ڈراموں کو تلاش کر کے ان کے متن کو تصحیح کے ساتھ ایڈٹ کیا جائے کیوں کہ متن کی عدم موجودگی میں آیندہ کام کرنے والوں کو اپنے طور پر ڈراموں کے متعلق رائے قائم کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں گی۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب نے اندر سبھا کا اصل نسخہ تلاش کر کے بڑی تحقیق اور چھان بین کے بعد مع شرح اندر سبھا مرتب کر دیا ہے جو ان کی مشہور کتاب اردو ڈرامہ اور اسٹیج میں شامل ہے۔ حال ہی میں مسیح الزماں صاحب لکچرر شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی نے ایک کم قیمت ایڈیشن امانت کی اندر سبھا کا مرتب کر کے عام طالب علم کے لیے فائدہ اٹھانے کا اچھا موقع فراہم کر دیا ہے۔

کتاب کی ابتدا میں فاضل مرتب نے ۶۰ صفحات کا ایک مقدمہ بھی شامل کر دیا ہے جس میں اردو میں ڈرامہ نگاری کے ابتدائی نمونوں کی بھی بحث اٹھائی ہے۔ امانت کے دور اور فن کا جائزہ لیا ہے اور پھر یہ رائے قائم کی ہے کہ امانت اور اندر سبھا ہی دراصل اردو کے پہلے ڈرامہ نگار اور ڈرامہ ہیں۔ مقدمہ کے بعد اندر سبھا کا پورا متن شامل ہے جس میں فاضل مرتب نے چھپائی اور لکھائی کی صحت کا اچھا خاصا خیال رکھا ہے۔ کسی نسخے کا حوالہ اس متن کے لیے نہیں دیا گیا کہ یہ متن انھوں نے کہاں سے حاصل کیا لیکن یہ اندر سبھا پروفیسر مسعود حسن رضوی کی ترتیب دی ہوئی اندر سبھا کا ہی متن معلوم ہوتی ہے۔ مسیح الزماں صاحب تحقیق کے فن میں اچھی خاصی نظر رکھتے ہیں، مراثی میر اور اردو تنقید کی تاریخ، ان کی دقیق بینی کا اچھا ثبوت ہیں لیکن زیر تبصرہ کتاب میں چند باتیں ایسی اٹھائی گئی ہیں جو کافی بحث طلب ہیں اور جنھیں مرتب نے اس طرح تسلیم کر لیا ہے جیسے وہ مصدقہ باتیں ہوں۔ فاضل مرتب نے لکھا ہے۔

"اندر سبھا ہماری قومی روایت کی اہم کڑی اور تھیٹر کا نقطۂ آغاز ہے"

"انیسویں صدی کے نصف کے قریب جب اندر سبھا لکھی گئی اس وقت شمالی ہندوستان میں ڈرامے یا اسٹیج کی کوئی روایت نہیں تھی،"

"امانت کے سامنے نہ کسی زبان کا کوئی ڈرامہ نہ بارے میں واقفیت حاصل کر سکتے"

یہ خیال درست نہیں۔ اندر سبھا نہ امانت کے ذہن کی پیداوار ہے اور نہ ہی اس کے کردار امانت کے تخلیق کیے ہوئے ہیں اور نہ قصہ ہی خود ان کا اپنا ہے۔ امانت سے کچھ پہلے راجا گوپی چند اور جلندر کے ڈرامے کے اسٹیج کیے جانے کی روایت ڈاکٹر عبد العلیم نامی نے اپنی کتاب اردو تھیٹر میں ص ۱۹۲-۹۳ پر دی ہے جس کا ذکر خود فاضل مصنف نے کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ ڈرامے مرثیہ اسٹیج پر کھیلے گئے جس کے مرکزی عنصر ہاتھ نظر سیخے تماشے ہوتے ہیں جنھوں نے پہلے تھیٹر کی بنیاد رکھی، ۱۸۹۱ء میں پھر سے اسے ترتیب دیا جس پر متعدد کورنے بہت سے ڈرامے لکھے جس میں اردو کے ڈرامے زیادہ بتائے جاتے ہیں۔ ان اردو ڈراموں کی ایک فہرست ڈاکٹر نامی نے اردو تھیٹر میں ص ۱۹۲-۹۳ پر دی بھی ہے جن میں سے چند۔ مع مرتب، یہاں نام معہ ان تاریخوں کے لکھے جاتے ہیں جن میں یہ اسٹیج کیے گئے۔

۱۔ ۱۸۵۳ء/۱۲۶۹ھ میں راجا گوپی چند اور جلندر ۲۔ ۱۲۷۰ھ میں پھر راجہ گوپی چند اور جلندر، انگیٹھے خاں، حاجی میاں اور ملازم پیکھے خاں، حاجی میاں اور افضل معہ نقل قوال خانہ، پٹھان سفریز اور نگو معہ نقل علاؤ الدین اور بانو ...

۳۔ ۱۸۵۵ء میں پھر راجہ گوپی چند اور جلندر، سیتا کی شادی معہ راس لیلا، اس کے ساتھ ساتھ اردو کے کچھ کومک (comic) بھی وجود میں آ گئے تھے۔ اردو کا ایک ایسا کومک شریمتی جی بتایا جاتا ہے جو ۲۶ نومبر ۱۸۵۳ء کو بمبئی تھیٹر پہلے پہل ہی بمبئی میں دکھلایا گیا۔ ڈاکٹر نامی نے ڈراموں کے یہ نام اور تفصیلات کہاں سے اکٹھا کیں اگر ان کے حوالے مکمل معہ اقتباسات کے ہوتے تو بہتر ہوتا لیکن ایسا نہیں ہے۔ تاہم جان گلکرسٹ نے جب اپنی کتاب ہندوستانی زبان کی قواعد ۱۷۹۶ء میں مرتب کی تو اس میں ہملٹ اور ہنری ششم کے کچھ حصوں کے ترجمے شامل کر دیے تھے۔ پھر کاظم علی جوان نے شکنتلا کا اردو ترجمہ ۱۸۰۱ء میں پیش کیا۔ ان ترجموں سے بھی ڈرامے کا ایک ماحول اور رجحان پتہ چلتا ہے۔

اگر کوئی ان سب کی تمام مثالوں اور شواہد کو مسترد کر دے تو خود لکھنؤ میں اندر سبھا سے پہلے کی مثالیں ڈراموں کی موجود ہیں جنھیں اس وقت صرف رہس یا رہس مبارک یا جلسہ کہا جاتا تھا۔ (اندر سبھا کو بھی امانت نے رہس اور جلسہ ہی کہہ کر پیش کیا تھا) یہ رہس اور جلسے واجد علی شاہ اختر کے لکھے ہوئے تھے۔ جسے امانت کے علاوہ بھی لکھنؤ کے ہزاروں آدمیوں نے دیکھا سنا تھا۔ امانت نے انھیں شاہی رہسوں کو اپنا نمونہ بنایا تھا۔ اس سلسلے میں ثبوت کے لیے پروفیسر مسعود حسن رضوی کی چند عبارتوں کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"اس امر میں کسی کو ذرا شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ انھوں نے (امانت نے) اپنے شاگرد اول مرزا عابد علی عبادت کی فرمایش سے رہس کے طور پر اندر سبھا تصنیف کی۔ یہ رہس جس

۱؎ اردو تھیٹر ۱۹۶۲ اور جان گلکرسٹ آج کل ڈرامہ نمبر گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۹ اور اسی کتاب مصنفہ عتیق صدیقی کے ص ۲۹۳ سے ص ۲۹۳ تک یہ ترجمہ دیکھے جا سکتے ہیں۔

کو امانت نے اپنے پیش نمونہ بنایا۔ یقیناً لکھنؤ کا وہی شاہی رہس تھا جس کا تفصیلی بیان انھوں نے شرح اندر سبھا میں لکھا ہے۔ اندر سبھا رہس کے نمونے پر لکھی گئی تھی اس لیے ابتدا میں وہ بھی رہس ہی قرار دی گئی۔

شاہی رہس کا پہلا جلسہ رادھا کنھیا کا جلسہ اردو ڈرامے کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لکھنؤ میں شاہی رہس کا جلسہ ۱۲۵۹ھ کے آخری حصے میں یا ۱۲۶۰ھ کے ابتدائی حصے میں ہوا۔ عیسوی سنہ اس وقت ۱۸۴۳ء تھا۔"

"عام طور پر لوگ امانت کو اردو کا پہلا ڈرامہ نگار اور ان کی اندر سبھا کو اردو کا پہلا ڈرامہ سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو کا پہلا ڈرامہ لکھنے اور کھیلنے کا فخر اودھ کے آخری بادشاہ سلطان عالم واجد علی شاہ کو حاصل ہے۔"

"اندر سبھا اردو کا پہلا ڈرامہ نہیں"

"جس طرح اردو کا پہلا ڈرامہ لکھنے اور اردو ڈرامے کا پہلا سٹیج تیار کرنے کا فخر واجد علی شاہ کے لیے ہے اسی طرح اردو ڈرامے کے لیے پہلا تھیٹر تعمیر کرنے کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے۔"

(یہ عبارت رہس منزل کے لیے ہے)

واجد علی شاہ اختر سے پہلے شاہی ڈرامے کی روایت نصیر الدین حیدر (۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء) کے زمانے سے ملنے لگی ہے۔ اس وقت ڈرامے یا ناٹک کو جلسہ کہتے تھے۔ نصیر الدین حیدر کے جلسوں کے تذکرے رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عبرت نام کی کتاب اور ولیم ناٹسن کی Private Life of an Eastern King میں دیکھے جا سکتے ہیں ان کتابوں میں راگنیوں کے جلسوں کا تذکرہ ہے۔ جلسے والیوں کا ذکر ہے کچھ چلیوں کے تماشے کو ڈراموں سے قریب لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

"ایک راگنی کی صحبت جس دن ہوتی تھی اندر سبھا کی آبرو کھوتی تھی"

اس سے بھی پہلے نواب سعادت علی خاں کے دور میں رہس کھیلے جاتے تھے۔ اس دور کا مشہور رہس والا لالہ رام داس کرشن لیلا کی پیشکش کے لیے بہت مشہور تھا۔ بہت سی رہس منڈلیاں تھیں جو کالی ناگ لیلا، کنس لیلا، ماکھن چوری، ہرشچندر، وہر پلاد وغیرہ کی کھیلا کرتی تھیں اس سے پہلے سنسکرت ناٹکوں کی جو روایت رہ چکی تھی ان کا تذکرہ اس موقع پر نہیں کیا جاتا۔ (باقی آئندہ)

لکھنؤ کا عوامی اسٹیج ص۱۲۵

لکھنؤ کا شاہی اسٹیج ص۱۱۲ اس کے علاوہ محل خانہ شاہی ترتیب مرزا فدا علی خنجر مطبوعہ ۱۲ مارچ ۱۹۱۴ء والے ایڈیشن میں ص۴۸ پر رادھا کنھیا کے رہس کے سلسلے میں یہ عبارت ملتی ہے۔

"یہاں بانسوے رہس دھاری کی تیار ہوا...... پریوں کو رہس دھاری تیار ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ رہس دھاری ایک ناچ کا سامان ہے۔ ہندوؤں کے مذہب میں اس کی پرستش کی جاتی ہے...... اس میں کنھیا اور ان کے معشوقوں کی شبیہ اور ہیئت بنائی جاتی ہے۔ حقیقت میں جیسا رہس میری سرکار میں تیار ہوا ہے ایسا کہیں نہ تیار ہوا ہوگا۔ سب پریوں کو استادوں نے درست کیا ہے.... اس کی تفصیل یہ ہے سلطان پری نے رادھا جی کا بھیس بدلا ہے..... ماہ رخ پری نے کنھیا کی صورت بنائی ہے۔ سر پر مکٹ ہاتھ میں بانسری اور اس کے لوازمات جو کئی لاکھ روپیہ میں تیار ہوئے تھے...... یاسمن پری، عزت پری، دلربا پری وغیرہ کنھیا کے دوسرے معشوقوں کی صورت بنی تھیں...... اس ناچ میں حضرت کنھیا اور رادھا کے مباحثے کی کیفیت ہے..... جیسے ہندی دوہروں میں بیان کرتے ہیں چنانچہ دو دوہرے ——

مور مکٹ کٹ کاچھنی کر مرلی اور مال   یہ بانک موہن بسے سدا بہاری لال

دوہرہ زبانی رادھا

آؤ پیارے موہنا پلک ڈھانپ توہے لیوں   نہ میں دیکھوں اور کا نہ توہے دیکھن دیوں

حقیقت میں ایسا جلسہ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ جلسہ صبح کو نہیں ہوتا شام کے وقت ہوتا ہے...... صاحبات محل کے دیکھنے کے واسطے چقیں چھوڑ دی گئی تھیں اور سب صاحبات محل چلمنوں کے پیچھے سے دیکھ رہی تھیں۔"

اس بیان پر بھی دو دلچسپ باتیں بحث طلب پیدا ہوتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ رادھا کنھیا کا یہ وہی رہس ہے جسے ان کا پہلا رہس کہا جاتا ہے اور جو مسعود صاحب کے بیان کے مطابق ۱۲۵۹ھ کے آخری یا ۱۲۶۰ھ کے ابتدائی حصے میں ہوا یا کوئی دوسرا رہس ہے۔ کیونکہ محل خانہ شاہی کے آخر میں اس کتاب کی تکمیل کی جو تاریخ درج ہے وہ ۱۲۶۵ھ ہے یہ اصل کتاب "عشق نامہ" کی تاریخ ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے شاہی اسٹیج کے ص۲۰ پر رادھا کنھیا رہس کی تکمیل کی تاریخیں ۱۲۵۸ھ اور ۱۲۶۲ھ کے درمیان لکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں رہس ہے جس کا تذکرہ محل خانہ شاہی کے مذکورہ بالا صفحات میں ہے۔ ایک دلچسپ اشارہ اس تذکرے میں اور ہے کہ رادھا کے گائے ہوئے دوہرے (باقی کالم اول میں)

(باقی نوٹ کالم اول) میں شامل رادھا کنھیا رہس اور مسعود صاحب کے شائع کردہ رہس دونوں میں موجود ہیں۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج ص۲۱۶ میں یہ دوہرے یوں ملتے ہیں۔ ترتیب ضرور بدلی ہے۔

آؤ پیارے موہنا پلک ڈھانپ توہے لیوں   نا میں دیکھوں اور کو نا توہے دیکھن دیوں

سیس مکٹ کٹ کاچھنی کر مرلی ار مال   یہ بانک مو من بسے سدا بہاری لال

اور دوہرے ایک لفظ بھی مثلاً یہاں "سیس" ہے جبکہ وہاں "مور" اور "بانگ" "بانک"۔ (۲) دوسری بات یہ ہے کہ اگر باہر کے لوگ اس میں شامل نہ تھے۔ صرف گھر ہی کے لوگ تھے تو محلات چقوں سے پس پردہ کیوں دیکھ رہی تھیں ہو سکتا ہے کہ بیگموں سے پردہ رہا ہو کیونکہ پرانے گھرانوں میں آج بھی طوائفوں کے سامنے عورتیں نہیں آتیں لیکن واجد علی شاہ کے یہاں ایسے بھی واقعے محل خانہ شاہی میں ملتے ہیں کہ پریاں محل میں داخل کر لی جاتی تھیں اور پھر انھیں باہر جانے کی بھی اجازت ہو جاتی تھی۔ پھر محل میں دوبارہ داخل ہو جاتیں۔ ایسی صورت میں ان سے پردہ کچھ عجیب ہے۔ (۳) تیسری بات یہ کہ کنھیا، واجد علی شاہ نہیں بنتے تھے جیسا کہ عام خیال ہے بلکہ ایک پری بنی تھی جس کا نام ماہ رخ پری بتایا گیا ہے۔

۳۳ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج ص

۳۴ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج ص۱۲۱

۳۵ فسانۂ عبرت ص مصنفہ رجب علی بیگ سرور

غزلیں

جے کرشن چودھری حبیب

بے تعلق زندگی بھی زندگی ہوتی ہے کیا
سازِ دل خاموش ہو تو نغمگی ہوتی ہے کیا

یک بیک تاریک دل میں کیوں اجالا ہو گیا
یادِ یارِ مہرباں ہی روشنی ہوتی ہے کیا

دیکھ کر تجھ کو کرے گا کوئی کیوں سیرِ چمن
گل کے چہرے پر بھی ایسی تازگی ہوتی ہے کیا

جس نے تیرے حسن کی ضو دیکھ لی سمجھے ہے وہ
کیوں چمکتے ہیں ستارے چاندنی ہوتی ہے کیا

مست آنکھوں کی قسم کیوں رہ گیا ہاتھوں میں جام
میکدے میں آ کے بھی بے کیفی ہوتی ہے کیا

وصل ہو یا ہجر ہو یا انتظارِ یار ہو
دردِ دل میں حسرتوں میں کچھ کمی ہوتی ہے کیا

سادگی میں دلبری ہے دلبری میں سادگی
کوئی کیا سمجھے کہ ان کی سادگی ہوتی ہے کیا

یاد تیری آ گئی ہے پردیس میں کتنی حبیب
دوریِ منزل میں کوئی دلکشی ہوتی ہے کیا

ندیم مرادآبادی

میکدہ جھوم اٹھا دور میں جام آتے ہی
زندگی مل گئی ساقی کا پیام آتے ہی

ختم افسانے ہوئے جب ترا نام آتے ہی
اک حقیقت کی طرح بر سرِ عام آتے ہی

فرصتِ فکر و نظر دہر میں انساں کو کہاں
انتظار اور بڑھا صبح کا شام آتے ہی

کوئی آساں تو نہیں عشق میں تکمیلِ وفا
ہوش کھو دیتی ہے دنیا یہ مقام آتے ہی

جانے کیا ہو گیا خاموش نظر آتا ہے
دلِ دیوانہ کو اندازِ کلام آتے ہی

ساری دنیا کی نگاہوں سے چھپا جاتا ہے
آفتاب حشر کا اپنے لبِ بام آتے ہی

ظلمتِ شب میں بھی تو نور نظر آتا ہے
لوگ کیوں شمع جلا دیتے ہیں شام آتے ہی

مے اڑی جاتی ہے پیمانوں سے کیوں اے ساقی
میکدے میں ترے رندوں کا نظام آتے ہی

حسرتِ جلوہ گہِ ناز سے گذری ہے ندیم
زندگی معرکۂ عشق میں کام آتے ہی

تبسم نثار چھپال پوری

میں ہوں تری نگاہ میں تو ہے مری نگاہ میں
عشق بھی بے پناہ ہے حسن بھی بے پناہ ہے

پاس بھی ہیں وہ دور بھی، قرب بھی ہے فراق بھی
کتنا حسین ہے تصور میرے دل و نگاہ میں

جن کی طلب بھی معتبر تھی نہیں ان کو خبر نہیں
جن کی تلاش خام ہے آج بھی بیچ راہ میں

عشق ہے وجہِ دو جہاں عشق ہے بے پئے دو جہاں
ختم ہے جستجوئے زندگی عشق کی بارگاہ میں

زاہدو کیوں نہ بے اثر تقویٰ ہو کیوں نہ رائیگاں
کیف ہی کیف ہے ترے میکدہ کی نگاہ میں

ضبطِ الم کے امتحاں دار و رسن کے مرحلے
کون سی مشکلیں نہیں اہلِ وفا کی راہ میں

پلکوں پہ جب جلے چراغ آ گئیں تبسم آندھیاں
کتنا حسین ربط ہے اشک میں اور آہ میں

دلیپ بادل

ہم نے تو ہر پھول کو اپنا خون دیا سرسبز کیا
اہلِ چمن نے پھر بھی ہم کو خزاں کا آدیش دیا

ہر ساغر کو ہر شیشے کو ایک انوکھا رنگ دیا
امیدوں کے خون سے ہم نے میخانہ تعمیر کیا

آپ کے غم تو میرے غم ہیں، آپ کی خوشیاں دور سہی
دل نے بھی کس شوق سے آنسو دینا منظور کیا

اس کے حسنِ نظر کے صدقے اس کی نندی پہ قرباں
صہبائے رنگیں رنگ سمجھ کر جس نے ہمارا خون پیا

اپنا جرم یہی ہے بادل اپنی ہے تقصیر یہی
اس نگری کے ہر باسی کو ہم نے ہم سے یاد کیا

باپو کے نام
(قطعات)

واحد پریمی

دشمنِ تفریقِ مذہب، خوگرِ انسانیت
دیش کا جانباز تھا ہر قوم کا تھا راہبر

تو نے مر کے بھی دیا دنیا کو پیغامِ خلوص
پیکرِ اخلاص تھا تو امن کا پیغامبر

اے اہنسا کے پجاری اے پرستارِ خلوص
اے مددگارِ حقیقت اے بہی خواہِ وطن
تیرے دم سے تھی حقیقت میں بہارِ صبحِ نو
تو نہیں تو آج ہے کچھ اور ہی رنگِ چمن

یادِ زورؔ

(ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم کی چوتھی برسی پر)

وقار خلیل

تو نہیں بزم میں، ہر چیز وہی ہے کہ جو تھی

یہ ادارہ، یہ در و بام، یہ ایواں، یہ کلس
میوزیم اور کتب خانہ و سب زیں کا وقار
وہ اثاثہ بھی ہے محفوظ، وہ سرمایہ بھی
جن پہ نازاں ہے دکن جن سے سرافراز سخن
جن کے ایک ایک ورق پر ہے تری تصدیق
تیری چاہت، ترا اخلاص ابھی زندہ ہے
تو نے جو شمع جلائی تھی وہ تابندہ ہے
تو نہیں بزم میں، ہر چیز وہی ہے کہ جو تھی

وہی اگلی سی شرافت، وہی پہلا سا خلوص
حیدرآباد کے فنکاروں کی روشن نظری
فکر و دانش میں وہی پہلی سی آشفتہ سری
علم و تہذیب و ثقافت کی ہر اک وادی سے
تیری وارفتہ مزاجی کی صدا آتی ہے
فکر و فن سے ترے خوشبوئے وفا آتی ہے
تیری مہکی ہوئی یادوں سے معطر ہے دکن
اب بھی دامن کشِ دل ہے ترا محبوب چمن
زورؔ! باقی ہے ترا شہرِ نگاراں اب بھی
یاد کرتی ہے تجھے صبحِ بہاراں اب بھی

تو نہیں بزم میں، ہر چیز وہی ہے کہ جو تھی
یہ ادارہ یہ در و بام، یہ ایواں، یہ کلس

ندوم سیتاپوری

اقبال کی ایک غزل

محب مکرم مولانا عبدالرزاق راشد حیدرآبادی نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بہت سے منتشر کلام کو یکجا کر کے ۱۹۲۴ء میں پہلی بار کلیات اقبال کے نام سے ایک ایسا مجموعہ شایع کیا تھا جسے بجا طور پر اقبال کے شایان شان پہلا مجموعۂ کلام ہونے کا امتیازی فخر حاصل ہے۔ اس مجموعہ کی اشاعت کے لیے سر اکبر حیدری مرحوم کے توسط سے اشاعتی حقوق حاصل کیے گئے تھے اور کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک اقبال نے جو کچھ کہا تھا اور جس کی اشاعت کو وہ پسند کرتے تھے بہت کچھ اس مجموعہ میں سمٹ آیا تھا۔ پھر بھی اقبال کے ابتدائی کلام کا کچھ حصہ ایسا بھی ہے جسے یا تو اقبال نے اپنے انتخاب سے خارج کر دیا یا اس کلیات کی اشاعت کے وقت دستیاب نہیں ہو سکا۔ مثلاً "کلیات اقبال" (مطبوعہ عمدہ پریس حیدرآباد دکن ۱۳۴۳ھ) کے حصہ غزلیات کے "دود آتشنہ" میں اقبال کی ایک چھ شعر کی غزل شامل کی گئی ہے۔

کیا کہوں اپنے وطن سے میں جدا کیونکر ہوا اور اسیر حلقۂ دام ہوا۔ کیونکر ہوا
جائے حیرت ہے برا سارے زمانے کا ہوں میں مجھ کو یہ خلعت شرافت کا عطا کیونکر ہوا
ہے طلب بے مدعا ہونے کی بھی اک مدعا مرغ دل دام تمنا سے رہا کیونکر ہوا
حسن کامل ہی نہ ہو اس بے حجابی کا سبب وہ جو تھا پردوں میں پنہاں خود نما کیونکر ہوا
تیرے دیکھا ہے کبھی اے دیدۂ عبرت کہ گل ہو کے پیدا خاک سے رنگیں قبا کیونکر ہوا
پرسش اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ کیا ہوا۔ کیونکر ہوا

یہ غزل جہاں تک پتہ چل سکا ہے اب سے ستاون برس پہلے گلدستہ "تصویر یار" احمد آباد میں چھپی تھی اور اس میں مقطع سمیت گیارہ اشعار موجود ہیں البتہ مقطع کا مصرعہ ثانی میں اور اس پر "کے بجائے" اور اسیر ہے یعنی گلدستہ میں مقطع اس طرح پر ہے۔

کیا کہوں اپنے وطن سے میں جدا کیونکر ہوا اور اسیر "حلقۂ دام ہوا۔ کیونکر ہوا

اس کے علاوہ کلیات کی غزل مذکورہ کا مطلع دوسرا، تیسرا، پانچواں اور چھٹا شعر بدستور گلدستہ کی غزل میں موجود ہے۔ کلیات میں صرف یہی ایک شعر!

حسن کامل ہی نہ ہو اس بے حجابی کا سبب وہ جو تھا پردوں میں پنہاں خود نما کیونکر ہوا

ایسا ہے جو ان گیارہ اشعار میں شامل ہے جو گلدستہ میں چھپے ہیں اس غزل کے بقیہ اشعار جو "کلیات" میں نہیں ہیں گلدستہ سے نقل کیے جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اشعار اقبال کے کسی اور مجموعے میں بھی شامل نہ ہوں۔

غزل کے سر نامہ پر "جناب شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور" لکھا ہوا ہے۔

تھا دکھانے دیکھنے کا کچھ تقاضا طور پر کچھ خبر ہے تجھ کو اے دل فیصلہ کیونکر ہوا
دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے پھر یہ وعدہ حشر کا صبر آزما کیونکر ہوا
موت کی ظلمت میں ہے پنہاں سراب زندگی مر گیا ہوں یوں تو میں، لیکن فنا کیونکر ہوا
موت کا نسخہ ابھی باقی ہے اے درد فراق چارہ گر دیوانہ ہے میں لا دوا کیونکر ہوا
حیرت مٹنے کا تماشہ دیکھنے کی چیز تھی کیا بتاؤں؟ میرا آون کا سامنا کیونکر ہوا
یوں تو مرتے ہو ہنسی ٹھٹھے پہ اے اقبال تم دل تمہارا اس قدر درد آشنا کیونکر ہوا

گیارہ اشعار کی یہ غزل گلدستہ "تصویر یار" بابتہ ماہ نومبر ۱۹۰۹ء کے صفحات ۳۰-۳۱ پر چھپی ہے۔

گلدستہ "تصویر یار" کا یہ پہلا شمارہ ہے! اگرچہ گلدستہ کے ابتدائی صفحات میں حسب رواج جلد نمبر اور شمارہ نمبر نہیں دیا گیا ہے لیکن گلدستہ کے آخری صفحہ پر ایک اعلان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ پہلا ہی شمارہ تھا۔ اس اعلان کا عنوان "اطلاع ضروری" ہے اور اس میں لکھا ہے۔

"اکثر احباب کا یہی اصرار تھا کہ ماہ نومبر میں گلدستہ "تصویر یار" شایع ہو جائے اسی لیے طرح پر "غزلیں بہت ہی تاکید" مطلوب تھیں مگر حسب خواہش طرح یہ حضرات شعرا نے توجہ نہ فرمائی آخر مجبور ہو کر "غیر طرح" اول نمبر" شایع کرنا پڑا!

اس کے بعد دسمبر ۱۹۰۹ء سے لے کر مارچ ۱۹۱۰ء تک کے مصرعہ طرح کا اعلان بھی کیا گیا ہے۔

۳۶ صفحات کا یہ گلدستہ "شعر و سخن احمد آباد (گجرات) سے سہیل سورتی کی ادارت میں نکلا تھا اور سرورق پر اس حلقۂ شعر و سخن کے ایک استاد ابو الاحسان منشی عبدالقادر اعجاز بھروچی "کا نام بھی شایع کیا جاتا تھا۔ یہ گلدستہ محمدی پریس احمد آباد میں چھپتا تھا۔ سرورق دوم پر اس کے جو "قواعد و ضوابط" دیے گئے ہیں ان سے اس کے اشاعتی مقصد پر بھی دلچسپ روشنی پڑتی ہے۔ کاروباری باتوں پر بھی!

(۱) یہ ماہواری رسالہ شہر احمد آباد سے ۲۰×۲۶/۸ تقطیع پر ۳۶ صفحے کے حجم میں ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شایع ہوتا ہے۔

(۲) قیمت سالانہ معہ محصول ڈاک ایک روپیہ آٹھ آنہ مقرر ہے......!

(۳) حسن انتظام یہ ہے کہ شعرائے نامی گرامی کا ہم طرح کلام بیں انتخاب درج گلدستہ ہوگا۔ غیر طرح غزل فی شعر ایک آنہ اجرت پر درج گلدستہ ہوگی بشرطیکہ کوئی شعر معیوب نہ ہو۔ اجرت ہمراہ غزل آنی چاہیے۔

(۴) انتخاب بذریعہ کمیٹی ہوگا کسی صاحب کو اعتراض کا حق نہ ہوگا۔

(۵) گلدستہ تصویر یار بوس بازی نیز ناشائستہ الفاظ سے بری رہے گا۔

(۶) تمام بیرنگ خطوط واپس کر دیے جائیں گے۔ پنسل سے لکھی ہوئی غزل داخل دفتر کر دی جائے گی۔

"تصویر یار" کے اس شمارے میں ڈاکٹر اقبال کے علاوہ ان کے کئی ہم عصر شعرا کے نام بھی ملتے ہیں۔ احسن مارہروی، سائل دہلوی، محشر لکھنوی، عزیز لکھنوی، راقم دہلوی، نوح ناروی، ثاقب بدایونی، شمیم مچھلی شہری، آگاہ دہلوی (شاگرد غالب) جلال لکھنوی اور آغا شاعر دہلوی!

آغا شاعر کی دو غزلیں اس شمارے میں چھپی ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

رخسار کے پرتو سے بجلی کی نئی دھج ہے گیسو، آنکھ جھکی ہے کیا سامنے سورج ہے
اے ابروئے جاناں تو اتنا تو بتا ہم کو کس رخ سے کریں سجدہ قبلے میں ذرا کج ہے
دلی کی زباں شاعر دلی میں کوئی سیکھے یہ کون جواہر ہے الفاظ کا مخرج ہے

غزل گوئی کی تجھے ہی نہیں توبہ کرو شاعر
اگر کچھ لطف ہے تو بلبل ہندوستاں تک ہے

"تصویر یار" کا یہی پہلا شمارہ میری نظر سے گذرا ہے اس لیے یہ پتہ نہیں چل سکا کہ یہ گلدستہ کتنے دنوں تک جاری رہا اور اس میں اقبال کا کلام پابندی کے ساتھ چھپتا رہا یا نہیں۔؟

مرتضیٰ علی قادری ایم اے

اردو کے پرانے رسائل

اسے حسنِ اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ ادھر تھوڑے دنوں میں مجھے اردو کے کئی پرانے رسائل دستیاب ہو گئے ہیں جو آجکل میرے زیرِ مطالعہ ہیں مجھے ان میں سے کئی رسائل بعض اہم خصوصیات کے حامل نظر آئے ہیں ان رسائل کا ایک ساتھ مطالعہ کرنے سے اردو زبان کے اخبار و رسائل کے تدریجی ارتقاء کو سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سے روشناس کرا دیا جائے سرِ دست ان میں سے دو کے متعلق یہ مضمون سپردِ قلم ہے۔

حضرات اہلِ علم سے گذارش ہے کہ اگر کسی صاحب کے پاس ان رسائل کے کچھ پرچے محفوظ ہوں تو از راہِ علم دوستی مطلع فرمائیں۔

میں نے ان رسائل میں لکھے ہوئے الفاظ کا املا ہو بہو ویسا ہی نقل کر دیا ہے جیسا چھپا ہوا ہے تاکہ اس زمانے کی لسانی خصوصیات بھی واضح ہو سکیں۔

بہارِ بےخزاں اس رسالہ کا جو پرچہ مجھے مل سکا ہے وہ ماہ نومبر ۱۹۰۳ء کا ہے جس کے آخر کے کچھ اوراق ناقص حالت میں ہیں اور شاید کچھ اوراق تلف ہو چکے ہیں اس حالت میں چودہ اوراق باقی ہیں جن میں سے بالکل ٹھیک حالت میں صرف سات ہی ہیں رسالہ بریلی سے شائع ہوتا تھا۔ رسالہ کا سرورق چونکہ دو رنگوں میں چھپا ہوا ہے اور کسی ماہ کا نام درج نہیں ہے اس لیے میرے خیال میں سال بھر تک سرورق بدلتا نہیں ہوگا۔ سرورق پر ایڈیٹر یا سرپرست کا نام کہیں بھی لکھا ہوا نہیں ہے یہ شعر لکھا ہے ؎

الٰہی پھول پھول اس باغ کا رشکِ گلستاں ہو
بہارِ بےخزاں اس میں شہِ دوراں غزل خواں ہو

اور اس کے ساتھ ہی یہ عبارت درج ہے۔

"ہم بہت فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہمیں گلدستہ کے لیے یہ مبارک نام جہاں استاد ناظم یار جنگ بلبلِ ہندوستان عالیجناب حضرت نواب مرزا خاں صاحب داغ مدظلہٗ نے عطا فرمایا ہے۔"

اس عبارت کے پڑھنے کے ساتھ ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ رسالہ صرف مضامین نظم کے لیے وقف تھا۔ سرورق کے دوسرے صفحہ پر قواعد و ضوابط ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ رسالہ ہر انگریزی مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں شائع ہوتا تھا۔ رسالہ کے مہتمم جناب سید محمود علی عاشق بریلوی تھے ان کی ادارت میں ایک اخبار [illegible] نکلتا تھا بریلی میں ان کا ایک مطبع تھا جس کا نام "محمود المطابع" تھا آج عاشق کو لوگ بحیثیت شاعر بہت کم جانتے ہیں، بحیثیت صحافی کو کسی نے یاد ہی نہیں رکھا ہے اور یہ سلوک نہ صرف ان کے لیے ہوا ہے بلکہ اردو کے بیشتر صحافیوں کو اردو زبان نے بھلا دیا حسرت اور ریاض کے ساتھ کیا ہوا؟ کتنے لوگ ہیں جو آج "اردوئے معلی" اور "ریاض الاخبار" کا چرچا کرتے ہیں وہ تو یہ کہیے کہ حسرت کی غزل اور ریاض کی خمریات نے انھیں زندہ رکھا ہے۔

بہارِ بےخزاں میں ہر ماہ کے لیے ایک طرح دی جاتی تھی، ماہ نومبر ۱۹۰۳ء سے پہلے کے پرچہ کے لیے مصرعہ طرح "گھر سے باہر قدم ناز نو رکھا ہی نہیں" تھا کیونکہ "بقیہ طرح" کے عنوان سے اس شمارہ میں حضرت نوح ناروی کی غزل چھپی ہے جو ضابطہ نمبر ۲ "اگر کسی طرح پر غزلیں زیادہ آجائیں گی تو بقیہ دوسرے نمبر میں شایع کی جائیں گی" کے مطابق پچھلے شمارہ میں غزلوں کے زیادہ ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جانے کے باعث اس ماہ کے رسالہ میں شایع ہوئی ہے۔ غزل کا مطلع ہے ؎

نیک و بدِ عشق میں مجھ کو نظر آتا نہیں　　دل کا کچھ غم ہی نہیں جان کی پروا ہی نہیں

چند اور منتخب اشعار یہ ہیں ؎

کس مصیبت میں ہوں ہیں عاقبت اندیش　　وہی اچھے ہیں کہ جن کو غمِ فردا ہی نہیں
دیدۂ تر سے مرے ابر بھی شرمندہ ہے　　پانی پانی عرقِ شرم سے دریا ہی نہیں
آئی ہے صدا اے نوح قضا آئی ہے　　شبِ غم کوئی مرا پوچھنے والا ہی نہیں

اس کے بعد اس شمارہ کے لیے دی گئی طرح "ہمارے حال پر بھی اب عنایت ہونے والی ہے" پر شعراء کی غزلیں ہیں۔ غزلوں کی ترتیب تخلصوں کی ترتیب پر ہے طرح میں سب سے پہلی غزل احسن مارہروی کی ہے پوری غزل میں ان کے استاد داغ کا رنگ غالب ہے ؎

خزاں نے باغ میں آکر بلبل کیسی ڈالی ہے　　کہ پتے بھاگتے پھرتے ہیں لرزاں ڈالی ڈالی ہے
چڑھی رہتی ہیں آنکھیں اور پڑے رہتے ہیں تیور بھی　　جنابِ شیخ نے کیا خم کی خم گھر میں ڈالی ہے
جوانی میں انھیں اب کچھ نظر آجائے گا احسن　　ذرا کمسن ہے ابھی انکی طبیعت بھولی بھالی ہے

احسن کے علاوہ منشی لطیف احمد اختر لکھنوی خلف حضرت امیر مینائی، حافظ ارشاد علی بریلوی، حکیم ارشد حسین، محمد مہدی حسن آزاد شاہجہانپوری، سید علی احمد اظہر بریلوی، سید کرامت علی امیر، محمد اعجاز حسین بریلوی، منشی گوبردھن پرشاد امیر بھاگلپوری، سید نجم الدین احمد انجم سندیلوی، لال بہادر انجم، حکیم عبدالکریم برہم، بشیر الدین بریلوی، منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی، منشی تہور علی بریلوی، منشی تہور علی خاں کانپوری، جلیل حسن، حافظ جلیل الدین حافظ جلیل بھیق، جناب حامد شاہ شاہجہانپوری، حسن رضا خاں بریلوی، حکیم بریلوی، خوشنود بریلوی، حلم بریلوی، خیال بریلوی، داغ دہلوی، روشن بریلوی، ریاض خیرآبادی، زہیر بریلوی، زیبا رائے بریلوی، زیبا بدایونی، سیف شاہجہانپوری، شمس فرخ آبادی، شمس بریلوی، شہیر مچھلی شہری، شید بدایونی، شید خیرآبادی، صادق بریلوی، ضیا بدایونی، ضیا دہلوی، طاہر فرخ آبادی، عاشق بریلوی، عزیز بریلوی، فارغ بریلوی، نفیس مچھروی، قیس بریلوی، کوثر خیرآبادی، لیثی بدایونی اور مشیر شاہجہانپوری کی غزلیات شامل اشاعت ہیں ان کے علاوہ بھی اور بہت سے شعراء کی طرحی غزلیات ان صفحات پر ہوں گی جو تلف ہو چکے ہیں یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف آخری ورق ہی ضائع ہوا ہو اور باقی غزلیں ماہ دسمبر کے شمارہ میں شائع ہوئی ہوں۔ اتنے شاعروں کی غزلیں ایک ہی ماہ میں شائع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ رسالہ اپنے وقت کا مشہور و معروف اور مقبول ترین رسالہ تھا، شمارہ میں داغ دہلوی، ریاض خیرآبادی، نوح ناروی، حافظ جلیل حسن، حسن بریلوی، احسن مارہروی اور تسلیم لکھنوی کی غزلوں کا شامل

اس بات کی دلیل ہے کہ رسالے کو اپنے زمانے کے بھی صف اول کے شاعروں کی اعانت حاصل تھی۔

آخر میں چند مشاہیر شعراء کی غزلوں سے انتخاب پیش ہے۔

داغ دہلوی

یہاں شکوہ پہ شکوہ ہے وہاں گالی پہ گالی ہے
بہت کچھ ہوتی رہتی ہے بہت کچھ ہونے والی ہے

ابھی کیوں کر کہ تک مجھ کو غم فرقت کھاتا ہے
کوئی [illegible] قسم کھانے کی کھائی ہے

ابھی میری بھولی بھالی ان کی باتیں خود ستائی ہے
مگر جینوں [illegible] قیامت ہونے والی ہے

ہوئے ہیں چار سجدوں پر یہ دعوے زاہدو تم کو
خدا نے [illegible] جنت [illegible] ہے

حافظ جلیل حسینی

تمہارے گھر کی [illegible] ہم سے خجلی پھر اٹھالی ہے
ہزاروں حسرتوں پر ایک حسرت خاک ڈالی ہے

جدھر بیٹھا امیدوں کو تو [illegible] حسرتیں دل کی
سمٹ کر تم بھی [illegible] جگہ تھوڑی سی خالی ہے

تسلیم لکھنوی

چھپی ہے تم سے کیوں ناتوانی اپنی پردہ داری کی
یہ دفتر زر مری سوز [illegible] بھی بھالی ہے

مقدر میں لکھی روز ازل سے پائمالی ہے
مری ہستی بھی بزم دہر میں تصویر قالی ہے

جہاں میں اس بحر نے ہم نے دیکھے [illegible]
حباب آسا ابھرتا ہے مگر باطن میں خالی ہے

ریاض خیرآبادی

نظر کی چوٹ کب دل کی نزاکت سہنے والی ہے
[illegible] اس کو تھے ساقی [illegible]

[illegible] مے خانہ ہے ہم ہیں
[illegible] گزرتی ہے عجب آسودہ حالی ہے

[illegible] اس [illegible]
چمن کر اب [illegible] آنکھوں [illegible]

مسیحا

مسیحا کا مجھے ایک ہی پرچہ مل سکا ہے جو فروری ۱۹۰۴ء کا ہے یہ رسالہ امرتسر سے منشی مولا بخش کشتہ امرتسری کی ادارت میں نکلتا تھا رسالہ چھوٹی تقطیع (×) کا ہے جو چوبیس صفحات پر مشتمل ہے۔ رسالے کے سرورق پر یہ شعر لکھا ہے ؎

جان بخش بے مبالغہ اپنا کلام ہے
زندہ ہوا ہے دم سے مسیحا کا نام ہے

جو رسائل اردو زبان میں نکلتے تھے ان میں سے بیشتر گلدستے شعر و شاعری ہوا کرتے تھے مضامین نثر کی طرف نہ تو ایڈیٹر حضرات توجہ کرتے تھے اور نہ ہی قارئین دلچسپی لیتے تھے زیادہ تر اردو رسائل میں ہر ماہ ایک طرح پر مختلف شعراء کی غزلیں شائع کر دی جاتی تھیں حالانکہ یہ کام بھی آسان نہ تھا [illegible] طور سے مشاہیر شعراء کرام سے طرح پر غزلیں حاصل کرنے میں کافی جانفشانی کرنا پڑتی ہوگی، ویسے کبھی کبھی کوئی غیر طرحی غزل یا نظم بھی شائع کر دی جاتی تھی یہاں تک [illegible] ہر ماہ کے لیے ایک طرح دے کر اس طرح میں شعراء کی غزلیں شائع [illegible] کا سوال ہے یہ رسالہ بھی اپنے معاصرین کے نقش قدم پر چلتا تھا میرے خیال میں اس وقت کسی رسالے کا اس کے بغیر مقبول ہونا مشکل ہی نہیں تھا لیکن یہ رسالہ اپنے زمانے کے دیگر اردو رسائل سے کئی امور میں مختلف بھی تھا ایڈیٹر نے اس پرچہ میں "کچھ اپنی نسبت" کے زیر عنوان لکھا ہے۔

"ہمیں اس امر کے اظہار میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ ہمارا گلدستہ شرقی علم و ادب خصوصاً الہامی شاعری کا حامی ہے مگر ساتھ ہی ہم یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ رفتار زمانہ کے لحاظ کرتے ہم اپنے اردو ادب کو ترقی و اصلاح سے مستغنی نہیں سمجھتے اسی واسطے ہم نے مسیحا کو صرف گل و بلبل اور حسن و عشق تک محدود نہیں رکھا بلکہ یہ عزم بالجزم کرتے ہیں کہ جہاں تک تائید ایزدی ہمارے شامل حال ہو اور مصلحت وقت اجازت دے اس رسالے کو مشرقی و مغربی دونوں قسم کی علمی خوبیوں اور آثار ترقی سے مزین کر کے شعر و شاعری کے ساتھ اخباری مذاق کی اہم اور مفید و دلچسپ باتیں بھی ہدیۂ ناظرین کرتے رہیں۔ خلق اللہ کی طبی خدمات کے علاوہ علمی ترقی اور اخلاقی اصلاح اور ملکی و قومی صلاح و فلاح پر بھی بقدر امکان نظر رکھیں....."

"کچھ اپنی نسبت" سے پہلے "دستور العمل" دیا گیا ہے۔ اس میں بھی اول نمبر پر اعلان کیا گیا ہے کہ اس میں ملکی و قومی خبریں، مفید عام معلومات، کارآمد باتیں اور مذاق، لطائف و ظرائف، طبی مضامین اور مجرب نسخوں کے علاوہ شعرائے نامدار کا کلام طرحی درج ہوتا ہے"

ترتیب کے اعتبار سے مسیحا حصۂ نظم اور حصۂ نثر میں تقسیم تھا حصۂ نظم میں سب سے پہلے نواب میر محبوب علی خاں آصف کی غزل پر منشی رائے بھیسی نرائن آذر کی تضمین ہے جس میں اٹھائیس بند ہیں نظم اس بند سے شروع ہوتی ہے ؎

جانو نہیں اپنے عشق میں ہی مبتلا مجھے
سمجھو نہ شغل غیر کے تم بے وفا مجھے
مرغوب دل سے تم ہیں لے دلربا نہیں
چاہوں جو اور کو تو اٹھا لے خدا مجھے
میں باوفا ہوں آپ نے سمجھا ہے کیا مجھے

اور آخری بند یہ ہے ؎

آذر جو بے وفا ہے تو اچھا یوں ہی سہی
سمجھا زبح ادا ہے تو اچھا یوں ہی سہی
اس سے نہیں گلا ہے تو اچھا یوں ہی سہی
آصف اگر برا ہے تو اچھا یوں ہی سہی
کوئی بھلا دکھاؤ تو ایسا برا مجھے

اس طویل نظم کے بعد طرح گذشتہ "مسیحا" کے زیر عنوان یہ مصرعہ طرح دیا گیا ہے ؎

ہم نے وہ پھول چنے ہیں جو گلستاں میں نہیں

اور پھر اس طرح پر ایک غزل منشی محمد سرفراز علی خاں بریلوی کی ہے۔ زیر تبصرہ شمارہ کی طرح یہ تھی۔

جنت میں بھی یاد آئے گا نقشہ ترے گھر کا

اس طرح پر پندرہ شاعروں کی غزلیں ہیں جن کی ترتیب تخلصوں کی ترتیب پر ہے ان میں سے شاعروں کے نام یہ ہیں۔ قمر امرتسری، آزاد، شکوہ آبادی، آصف، حقیر پشاوری، مصفد امرتسری، تیر [illegible]۔ ان غزلیات کے بعد طرحات آئندہ دی گئی ہیں

حصہ نثر میں ذیل کے عنوانات سے مضامین ہیں:

۱۔ حفظ ما تقدم و علاج مجرب۔ وبائی امراض سے بچنے کے لیے چند مشورے اور کچھ امراض کے لیے آسان نسخے
۲۔ بھٹکتی ہوئی خبر۔ ایک ظریفانہ مضمون۔ بقلم [illegible]
۳۔ لطائف۔ دو لطیفے
۴۔ یادرفتگان (مسلسل) فارسی کے شعراء کا مختصر تذکرہ
۵۔ ملکی امراض۔ تعلیم نسواں کے خلاف ایک مضمون
۶۔ یادگار دربار۔ مولوی فیروز الدین صاحب کی تصنیف "یادگار دربار" پر تبصرہ
۷۔ شوکت میرٹھی اور ہم۔ شوکت میرٹھی کے کلام پر تنقید
۸۔ آئینۂ عالم۔ اہم خبروں کا خلاصہ
۹۔ مفید معلومات۔ دنیا کے مختلف قبیلوں، قوموں اور ملکوں کی رسومات کے بارے میں معلوماتی نتیجے۔

مراسلات

لغت "مذکر یا مونث ؟

۲۲ راگست ۶۶ء کے "ہماری زبان" میں میرا ایک دو تین سطر کا نوٹ لفظ لغت کی تذکیر و تانیث کے متعلق شائع ہوا تھا جس میں میں نے عرض کیا تھا کہ یہ لفظ بالاتفاق جمہور اردو کی نظر میں مذکر ہے۔ اس ضمن میں ۲۲ راگست ۶۶ء کے "ہماری زبان" صفحہ ۴ پر خود ادارہ کا ایک فٹ نوٹ اور دو تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ اس لفظ پر جو کچھ مجھے لکھنا ہے اختتام بحث پر تحریر کروں گا۔ سردست تنقیحات، کا صرف ایک ضابطہ متعین کر لینا ہے تاکہ بحث میں غیر ضروری پھیلاؤ نہ پیدا ہونے پائے۔

واضح ہو کہ "لغت" عربی سے ماخوذ اردو کا ایک معیاری لفظ ہے جسے مستند اردو لغت نویسوں نے مستند تذکیر و تانیث کے رسائل لکھنے والوں نے اور مستند اردو شعراء نے بلا استثنا اور بالاتفاق مذکر مانا ہے اور یہ فیصلہ ایک اصول زبان بن چکا ہے۔ میرے اس دعوے کی تردید کی صرف ایک صورت ہے کہ مستند اردو لغتوں سے، مستند تذکیر و تانیث کے رسالوں سے، یا مستند شعراء کے کلام سے اس کے خلاف سندیں پیش کی جائیں اور یہ دکھایا جائے کہ اس لفظ کی تذکیر و تانیث مختلف فیہ ہے یا اسے مونث مانا گیا ہے۔ اس طریقہ استدلال کے کوئی معنی نہیں کہ فلاں صاحب کی تحریر میں یہ لفظ مونث مرقوم ہے۔ عام تحریروں میں سہو کاتب، سہو تحریر اور خود صاحب تحریر کی غلطی کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ان تحریروں کی سند میں ایک متفقہ اور مسلم اصول کو رد نہیں کر سکتیں۔

لفظ لغت کے سلسلے میں ایک سوئے اتفاق ہوا ہے۔ انگریزی کا لفظ ڈکشنری جب اردو میں رائج ہوا تو "ی" پر ختم ہونے کی وجہ سے اس لفظ کو اصولاً مونث مانا گیا۔ وہ لوگ جن کی سماعت کو معقول تربیت نہیں ملی تھی ڈکشنری کے قیاس کی بنا پر لغت کو بھی مونث بولنے لگے۔ میرے خیال میں یہ غلطی یہیں سے شروع ہوئی ہے۔

ادارے کے مذکورہ فٹ نوٹ صلہ میں لفظ لغت کے لیے مرقوم ہے کہ "اردو میں لغت لفظ کے معنی میں مذکر اور ڈکشنری کے معنی مونث"۔ اس گراں قدر فتوے نے مجھے محو حیرت کر دیا ہے۔ تذکیر و تانیث کے ضمن میں لغت بمعنی لفظ اور لغت بمعنی ڈکشنری کا نازک فرق آج تک کسی کتاب لغت میں میری محدود نظر سے نہیں گزرا نہ یہ نکتہ لطیف میں نے کسی زبان داں استاد سے سنا۔ یہ خیال تو بالکل اس طرح کا ہے جیسے کوئی کہے کہ "آدمی" بمعنی Man مذکر اور آدمی بمعنی نسل انسانی مونث۔ مجھے دلی مسرت ہوگی اگر سند اور دلائل سے یہ نکتہ مجھے بھی سمجھا دیا جائے۔

بقیہ دو تحریروں میں ایک تحریر جناب سید دلید احمد برکاتی ٹونک کی اور دوسری تحریر جناب رشید الدین صاحب حیدر آباد کی ہے۔

تحریر اول میں محترم سید صاحب نے سب سے پہلے صاحب فرہنگ آصفیہ مولوی سید احمد صاحب کی ایک تحریر اور ایک قطعے میں لفظ لغت کو مونث استعمال ہوتے دکھایا ہے۔ لیکن فرہنگ آصفیہ میں لغت کو صرف اسم مذکر تحریر کیا گیا ہے۔ نہ اسے مونث کہا گیا ہے نہ مختلف فیہ اور نہ ڈکشنری کے معنی میں اس کا صیغہ بدلنے کی کوئی ہدایت کی گئی ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد مذکورہ صاحب فرہنگ آصفیہ کی تحریر اور قطعے میں سہو کاتب کے علاوہ کسی اور چیز کا امکان نہیں رہتا۔

محترم سید صاحب نے حامد حسن قادری کی ایک تحریر میں، جامعہ کے نصاب کی پانچویں کتاب میں اور انجمن ترقی اردو کی کسی فہرست کتب میں لفظ لغت کا استعمال بصیغہ تانیث دکھایا ہے اس کا اصولی جواب تو صرف یہ ہے کہ یہ سب بلاشبہ اغلاط ہیں۔ ہاں سہو کاتب یا سہو تحریر کی گنجائش بہرحال باقی رہتی ہے۔

محترم رشید الدین صاحب حیدر آباد نے حیدر آباد اور دکن میں تانیث لفظ لغت کے رواج کا ذکر فرماتے ہوئے مجھ پر یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ میں حیدر آباد یا دکن کے ادیبوں کو شاید مستند نہ مانوں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دکن نے عہد قدیم سے لیکر عہد حال تک اردو کی عظیم ترین خدمتیں انجام دی ہیں۔ جس طرح لکھنؤ میں "کھلو" اور "قبوز" بولنے والے جہلا مستند نہیں، اسی طرح حیدر آباد میں "تم کھائے" اور "ہم مارے" بولنے والے ثقات میں شمار نہیں ہوں گے۔

رشید الدین صاحب نے دکن میں قطعاً لفظ لغت کو مونث بولتے ہوئے سنا ہوگا اگر یہ نہ ہوتا تو سمعی غلطی کی بنا پر یہ سہو ان کے پیش رو مولوی عبدالحق کی تحریر میں کیونکر ہوتا۔ ہاں سہو کاتب کی گنجائش اب بھی باقی ہے۔ مولوی صاحب کے لیے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہوں گا لیکن اگر ان کا کوئی جوشیلا معتقد ان کی اس تحریر کو سند بنانے کی کوشش کرے گا تو میں کہوں گا کہ جمہور ثقات اردو کی رائے کو مولوی صاحب کی تحریر قطعاً رد نہیں کر سکتی۔ غلطیاں بڑے بڑے مستند اساتذہ سے ہوئی ہیں جو آج بھی غلطیاں مانی جاتی ہیں۔ مولوی عبدالحق نے بھی غلطی کی ہے۔

(صفدر آہ)

یہ مطلع نظام رام پوری کا نہیں

محترم ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے اپنی کتاب "اردو غزل" میں نظام رام پوری کے کلام کے انتخاب میں سب سے پہلے اس مطلع کو دیا ہے ؎

کون پرساں ہے حال بسمل کا
خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

(اردو غزل تیسری اشاعت صفحہ ۴۰۵)

دراصل یہ مطلع نظام رام پوری کا نہیں ہے۔ نظام کے کسی انتخاب، یا دیوان یا کلیات میں بھی نہیں ہے، اور کسی قلمی نسخے میں بھی نہیں ہے۔ اس مطلع کا خالق علی بخش بیمار رام پوری ہے اور رام پور کے شعراء سے متعلق ہر تذکرے میں بیمار کے نام سے ہی یہ مطلع درج ہے۔

(ذوالفقار آفریدی، بمبئی)

آئندہ ہفتہ اردو سے متعلق مزید بات چیت متوقع

اردو کے مسائل کو حل کرنے کے لیے آئین کی دفعہ ۳۴۷ کا استعمال ضروری

دہلی ۱۵ اکتوبر :- باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ آئندہ چند روز کے اندر اردو کے سلسلہ میں دہلی میں اعلیٰ سطح کی بات چیت متوقع ہے جناب فخر الدین علی احمد صاحب جن کے ذمہ وزیر اعظم نے یوپی اور بہار کے وزرائے اعلیٰ سے اردو کے سلسلہ میں بات چیت کرنے کی ذمہ داری سونپی تھی برابر دونوں ریاستوں کے سربراہوں کے ساتھ رابطہ قائم کیے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اس بات چیت کی تکمیل کے بعد ہی صدر جمہوریہ ہند اردو کے بارے میں آئین کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت اپنا فرمان جاری کریں گے۔

یہ بھی پتہ چلا ہے کہ وزیر اعلیٰ بہار اردو کو سہولتیں دینے کے لیے تیار ہیں وزیر اعلیٰ یوپی کا رویہ ابھی تک موافقانہ نہیں رہا۔ پتہ چلا ہے کہ وزیر اعلیٰ یوپی اس سلسلہ میں اپنی کابینہ کے ساتھیوں کے ساتھ صلاح و مشورہ کریں گی، وہ ان کے دلی آنے پر پھر بات چیت ہوگی۔ جہاں تک دلی کا سوال ہے، مسٹر فخر الدین علی احمد صاحب نے انجمن ترقی اردو دلی اسٹیٹ کے تیار کردہ کیس کا مطالعہ کرنے کے بعد دہلی کے کچھ لیڈروں سے جن میں مسٹر شتاق احمد صاحب چودھری برہم پرکاش صاحب اور لالہ شام ناتھ شامل ہیں اس سلسلہ میں گفتگو کی ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ جب دو ماہ قبل انجمن ترقی اردو دلی اسٹیٹ نے وزیر اعظم کو اپنا مطالبہ پیش کیا تھا۔ تو اس وقت مسز گاندھی نے ارشاد فرمایا تھا دہلی کے مذکورہ مقامی لیڈروں کا نقطۂ نظر جاننا چاہا تھا اور انجمن کے وفد نے انھیں بتایا تھا کہ دہلی کی لیڈر شپ کسی بھی سطح پر اردو کے خلاف نہیں ہے لیکن رکاوٹ وزارت داخلہ کی طرف سے حائل ہوئی ہے وفد نے جناب فخر الدین علی احمد سے بھی ملاقات کی تھی اس عرصہ میں جمعیۃ علماء ہند اور نیشنل سالیڈرٹی کونسل نے اپنے مطالبہ ناموں میں اردو کے مطالبہ پر زور دیا اور وزیر اعظم و صدر کانگریس کے ساتھ ملاقاتوں میں اردو کے حق کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ ۳۰ رستمبر کو دلی میں بہار اور یوپی کے سلسلہ میں جو بات ہوئی تھی یوپی کے سلسلہ میں بھی انجمن ترقی اردو دلی کی طرف سے ضروری کاغذات جناب فخر الدین علی احمد صاحب کی خدمت میں مسز انیس قدوائی کے ذریعے پیش کیے گئے تھے۔

انجمن ترقی اردو ہند نے یوپی بہار اور دلی کے سلسلہ میں اپنا محضر نامہ یوپی کے ساڑھے بائیس لاکھ اور بہار کے ساڑھے بارہ لاکھ دستخطوں سے صدر جمہوریہ ہند کو پیش کئے تھے۔ پھر ۱۹۵۸ء کی دلی اردو کانفرنس میں ان کا اعادہ کیا گیا اس کے بعد وقتاً فوقتاً مطالبہ نامے پیش کئے جاتے رہے ۱۹۶۴ء میں دلی اردو کنونشن کے موقع پر پہلی بار اس سلسلہ کو عوامی بنا کر پیش کیا گیا۔

ان مطالبہ ناموں میں اردو کو دلی یوپی اور بہار کی علاقائی زبان تسلیم کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ صدر جمہوریہ ہند آئین کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت ایسا کر سکتے ہیں۔ یقین کیا جاتا ہے کہ بہار کی طرح یوپی میں بھی فضا سازگار ہو جائے گی جہاں تک دلی کا تعلق ہے اب یہاں میٹرو پولیٹن کونسل بن چکی ہے۔ انجمن ترقی اردو کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ کونسل زبان کا سوال خود طے کرے گی اس سلسلہ میں انجمن کے اراکین نے میٹرو پولیٹن کونسل کے ذمہ داروں کے ساتھ رابطہ بھی قائم کیا جو اب بھی قائم ہے۔ تاہم ساتھ ہی انجمن کے کچھ ذمہ داروں نے حکومت اور کانگریس پارٹی کمان میں اس امر کے لیے کوششیں جاری رکھیں کہ صدر جمہوریہ ہند آئین کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت آرڈیننس جاری کریں اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ بعض اخبارات سرکاری حلقوں کے حوالے سے مخالفانہ ماحول پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور کہا جا رہا ہے کہ اردو کو اس کا حق دینے کے لیے صدر کے فرمان کا اجرا ضروری نہیں ہے یہ کوئی نئی کوشش نہیں ہے ۱۹۵۸ء میں وزارت داخلہ نے اردو سے متعلق جو زبان سے متعلق بیان جاری کیا اس کا حشر سامنے ہے انجمن نے اپنے بعد کے بھی مطالبہ ناموں میں اس بات کا حوالہ دیا ہے اور کہا ہے کہ اردو کو اس کا حق دینے کے لیے قانونی طور پر کارروائی ضروری ہے محض سرکلروں کا اجرا کافی اور اطمینان بخش نہیں ہے۔

اردو کے مطالبات کو جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس گیا کی قرارداد اور وزیر اعظم و صدر کانگریس کو اس کی یادداشتوں سے بہت زیادہ تقویت ملی نیشنل سالیڈرٹی کونسل کے وفد نے بھی جس میں مسز وجے لکشمی پنڈت۔ جی شامل تھیں اس مطالبہ کا اعادہ کیا وزیر اعظم نے اردو کے کیس کو بغور ساعت اور کچھ اقدام کرنے کا یقین بھی دلایا تھا۔

یوپی اور بعض دوسری ریاستوں کے ممبران پارلیمنٹ نے بھی علیحدہ علیحدہ آئندہ عام انتخابات کے پیش نظر کانگریس کے ذمہ داروں کو اردو کے مسئلہ کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس ہفتہ بھی ڈاکٹر گوپال سنگھ بیگم انیس قدوائی اور کئی دوسرے لیڈروں نے صدر کانگریس کا مراج سے تبادلۂ خیال کیا ہے۔

(الجمعیۃ)

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں توسیعی خطبات کا سلسلہ

دہلی۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایم اے کے طلبہ کے لیے توسیعی خطبات کا ایک ہفتہ وار پروگرام شروع کیا گیا۔ اس کا افتتاح ڈاکٹر تلسی رام پرنسپل شیواجی کالج کے خطبات سے ۲۲ اگست کو شام کو ساڑھے چھ بجے یونیورسٹی بلڈنگ کے کمرے نمبر ایف ۲۴ میں ہوا۔

ڈاکٹر تلسی رام نے افلاطون اور ارسطو کے تنقیدی نظریات سے بحث کرتے ہوئے یونان کے مجموعی نظام اقدار کا جائزہ لیا۔ انھوں نے حقیقت کے یونانی تصور کا جائزہ لیا اور نقالی اور تزکیۂ نفس کے نظریوں سے تفصیلی بحث کی۔ ڈاکٹر تلسی رام کا دوسرا خطبہ نشاۃ ثانیہ کے دور میں فن اور تنقید کی مختلف اقدار سے متعلق تھا اس میں انھوں نے ڈرائڈن کے نظریات سے بحث کی اور تیسرے خطبے اور چوتھے خطبے میں رومانی دور کے تنقیدی اصول و ضوابط پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ تنقیدی

نظریات دراصل کسی مخصوص عہد کے معاشرے اور فکری اور تہذیبی سانچے میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں اور اس طرح ان کی حیثیت روح عصر کی بھی ہوتی ہے۔

۱۹ ستمبر کے جلسے میں ڈاکٹر تلسی رام نے طلبا اور بعض اساتذہ کے سوالات کے جوابات دئے۔ عام طور پر اس جمالیاتی انبساط کا مسئلہ زیر بحث رہا، جو المیے سے حاصل ہوتا ہے۔

۲۹ ستمبر کو پروفیسر چاڈیورن گل پیٹرک وزٹنگ پروفیسر شعبۂ فلسفہ و سابق انچارج ہیومنیٹیز سیکشن راک فیلر فاؤنڈیشن نے موجودہ ادبی تحقیق میں تجزیے اور توجیہ کے مسائل کے موضوع پر ایم لٹ کے طلبہ کو انگریزی میں خطاب فرمایا۔ پروفیسر گل پیٹرک نے ترجمے اور تقابلی مطالعے کی اہمیت پر زور دیا۔ انھوں نے بتایا کہ آج کے تنقید نگار کے سامنے صرف صحیح متون کی تیاری ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ تحقیق کے حاصل کردہ مواد سے صحیح نتیجہ نکالنے کا سوال بھی نہایت اہم ہے۔

(سید ظہیر الحسن سکریٹری)

اردو میں درخواستیں لی جائیں گی

برہانپور نگر پالیکا کی منظوری

برہانپور نگر پالیکا کی جنرل میٹنگ میں مختلف امور پر غور و خوض ہونے کے بعد انجمن ترقی اردو کے صدر و میونسپل کونسلر عالیجناب مولانا حفظ الرحمن انصاری نے بھی گذشتہ میں ایک تجویز رکھی تھی جس پر غور فرمایا۔ آنجناب نے فرمایا برہانپور میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۸۰ فیصدی ہے جو برہانپور کی اکثریت کی زبان ہے اس سلسلے میں سرکاری اعلان بھی ہے کہ جہاں جس زبان کے جاننے والے ۱۵ فیصدی ہوں اس جگہ اسی زبان میں درخواستیں و دیگر اعلانات کریں اس کے علاوہ ضلع کلکٹر صاحب کا آرڈر جو نگر پالیکا میں ۶۲ میں آچکا ہے لیکن آج تک برہانپور نگر پالیکا نے اس پر عمل نہیں کیا اس تجویز پر جہاں دیگر گروپ نے تائید کی وہیں وائس پریسیڈنٹ جناب لکشمی داس ماسٹر نے پیش کیا تے ہوئے ایک سب کمیٹی کی تجویز رکھی جس کی تائید جناب ضمیر الدین صاحب نے کی جس پر تعجب بھی ہوا اور افسوس بھی اس کے بعد بہت رد و کد کے بعد برہانپور نگر پالیکا کے پریسیڈنٹ جناب چاچا شنکر چند کپور جی نے وعدہ فرمایا ہے کہ عنقریب ہی اردو میں درخواستیں لی جائیں گی آپ کے اس اعلان کے بعد گاندھی بھون ہال جہاں میٹنگ ہو رہی تھی تالیوں سے گونج اٹھا۔

(ملک و ملت)

میٹروپولیٹن کونسل دہلی کی تمام کارروائیوں کے لیے ہندی کے ساتھ اردو کے استعمال کا فیصلہ کیا گیا ہے

دہلی ۲۱ راکتوبر۔ دہلی کے ایگزیکٹیو کونسلر جناب رادھا رمن نے گذشتہ شام بتایا کہ دہلی کی میٹروپولیٹن کونسل کی ایگزیکٹیو نے کونسل کی تمام کارروائیوں کے لیے اردو کو وہ جگہ دینے کا فیصلہ کیا ہے جو ایک علاقائی زبان کی حیثیت سے ملنا چاہیے۔ جناب رادھا رمن انجمن ترقی اردو دہلی کے زیر اہتمام گاندھی جینتی کے سلسلہ میں ایک جلسہ سے خطاب کر رہے تھے۔ آپ نے گاندھی جی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو ہندوستان کی ایک اتحادی تہذیب میں اور دلکش زبان ہے یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ ہم اس زبان کو اتنا فروغ نہیں دے پائے جتنا دینا چاہیے۔ شمالی ہندوستان کے علاقوں میں جس میں دلی بھی شامل ہے گھر گھر اردو بولی جاتی ہے اس کے باوجود زبان کے سوال پر کافی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک مہاتما گاندھی کا تعلق ہے اگر میں غلط بیانی نہیں کرتا تو میں کہوں گا کہ وہ اردو کے دلدادہ تھے۔ انھوں نے گاندھی جی کے ہندوستانی زبان کے تصور کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ یہی زبان تھی جس کو ہم بولتے ہیں اور جس کو دیوناگری کے ساتھ ساتھ فارسی لپی میں بھی لکھا جاتا ہے۔

جناب رادھا رمن نے زبان کے سوال پر تعصب کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم سخت الفاظ استعمال کر کے زبان کو مشکل بنا رہے ہیں جہاں تک دہلی میٹروپولیٹن کونسل کا اور دہلی والوں کا تعلق ہے دہلی کے لوگ آج بھی اکثریت میں اردو بولتے اور سمجھتے اردو پڑھتے ہیں یہ درست ہے کہ ہندی ہماری قومی سرکاری زبان ہے لیکن اگر عورتوں کے تناسب کو نظر کر دیا جائے تو آج بھی مردوں میں جس زبان کا سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے وہ اردو ہے ہندی یا گورمکھی یا کوئی اور زبان نہیں ہے۔ عدالتوں یا دفتروں میں انگریزی اور ہندی کے ساتھ اردو کا زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

جہاں تک میٹروپولیٹن کونسل کا سوال ہے ہم نے یہ طے کیا ہے کہ کونسل کی تمام کارروائیوں میں اردو کو ہندی کے ساتھ جگہ دی جائے جو ایک علاقائی زبان کو حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم نے طے کیا ہے کہ چاہے انگریزی میں نہ ہو لیکن تمام کارڈ، سرکلر اور دوسرے کاغذات ہندی کے ساتھ اردو میں ضرور ہوں اردو کی ایک جگہ ہے جو اس کو ملنی چاہئے ہمارا خیال ہے کہ دلی میں صرف مخصوص اسکولوں ہی میں نہیں بلکہ تمام اسکولوں میں اردو پڑھانے کا انتظام ہونا چاہیے ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ وقت لگے لیکن ہم ایسا کرنا چاہتے ہیں ایگزیکٹیو کونسل میں اس کے بارے میں دو رائیں نہیں ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ انجمن ترقی اردو جس کا مقصد ہی اردو زبان کو فروغ دینا ہے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگی اور اردو کو وہ تمام آسانیاں مل جائیں گی جو ایک علاقائی زبان کو ملنی چاہیے اردو ہماری زبان ہے اور اس پر ہمیں فخر ہے ہمیں اسے فروغ دینا چاہیے تاکہ آیندہ نسلیں اس زبان کا فائدہ اٹھا سکیں۔

جلسہ کی صدارت چیف ایگزیکٹیو کونسلر مسٹر مشتاق احمد کو کرنی تھی تاہم وہ اپنی کسی فوری مصروفیت کے سبب نہ آ سکے۔ بیگم انیس قدوائی نے جلسہ کی صدارت کی۔

بہار برنی نے اس سے قبل کہا کہ یہ جلسہ قومی یکجہتی کے دن کے موقع پر ہو رہا ہے اس طرح اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ میر صاحب کو صدارت کے لیے دعوت دینے کا ہمارا مقصد یہ تھا کہ اس موقع پر ہم ان

سکریٹری جیت ایگزیکٹیو کونسل بننے کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا تاہم یاد دہانی بھی یہاں تشریف فرما ہیں انجمن ترقی اردو دہلی میں سے تھے۔ اس نظام کا خیر مقدم کرتی ہے یقین ہے کہ کانگریس اور دوسری جماعتوں کے وہ رہنما جو ہر قدم پر اردو تحریک میں ہمارے ساتھ رہے ہیں اور اس کونسل میں ہیں اردو کو اس کی جائز حیثیت دینے کے سلسلہ میں محبان اردو کی توقعات کو پورا کریں گے۔

گاندھی جی اردو شاعری کے آئینہ میں: اس عنوان سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (دہلی یونیورسٹی) نے گاندھی جی اور ہندوستانی کے موضوع پر تقریر کی۔ سلام مچھلی شہری نے نظم سنائی۔ آخر میں پنڈت سندر لال نے تقریر فرمائی ہندوستانی کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ کس زبان کے فیصلہ کے وقت سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کے کاسٹنگ ووٹ سے ہندوستانی کو نظر انداز کیا گیا حالانکہ ڈاکٹر راجندر پرشاد ہندوستانی پرچار سبھا کے صدر تھے آپ نے تفصیل کے ساتھ اب تک اردو زبان کی تحریک اور اس کو نظر انداز کیے جانے کی کوشش پر روشنی ڈالی
(الجمعیۃ)

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کی پہلی نشست

پٹنہ ۱۹ اکتوبر نئی مجلس عاملہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی پہلی نشست کل بتاریخ ۱۸ اکتوبر ۵ بجے شام کو انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں زیر صدارت غلام سرور صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو منعقد ہوئی۔

حسب ایجنڈا کارروائیاں عمل میں آئیں۔ جلسہ میں یہ طے ہوا کہ کانفرنس کی تجویز کی روشنی میں بہار کی اردو آبادی اپنی جد و جہد نہ صرف جاری رکھے بلکہ اسے تیز تر کر دے اور اس کے پہلے قدم کے طور پر ۳ نومبر ۱۹۶۶ء کو بہار بھر میں یوم اردو منایا جائے۔ یہ جلسہ اس امر کو پیش نظر رکھتا ہے کہ جب تک ہمارا مطالبہ تسلیم نہ کر لیا جاتا ہے ہماری تحریک جاری رہے گی۔ یہ جلسہ تمام اردو دوستوں کو آواز دیتا ہے کہ جب تک انجمن اس معاملہ میں ان کو ہدایت نہ کرے وہ اپنی تحریک جاری رکھیں اور اگلے اقدامات کا انتظار کریں۔ (سنگم)

سکریٹری گورنمنٹ راجستھان کے نام

جنرل سکریٹری ریاستی شاخ راجستھان کا خط

انجمن ہذا کی مقامی شاخ موضع بیری خورد ضلع ناگور نے اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ یہ فوجی لوگوں کی بستی ہے۔ اس وقت بھی تقریباً تین سو اشخاص یہاں کے باشندہ فوج میں نوکر ہیں اور سرحدوں پر مامور ہیں اور جو ضعیف لوگ گاؤں میں موجود ہیں وہ بھی فوجی پنشنر ہیں۔ مگر ہمارے بچوں کی تعلیم کا انتظام محکمہ تعلیم کی طرف سے ہمارے درخواست کرنے اور توجہ دلانے کے باوجود نہیں کیا گیا اور ہمارے بچوں کو ان کی مادری زبان کے ذریعہ اور مادری زبان کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ جبکہ اس گاؤں کے مڈل اسکول میں اردو مادری زبان والے طلبہ کی تعداد ۲۷۳ ہے اور غیر اردو والوں کی ۱۱۷۔ کل ۳۹۰ جس کی تفصیل یہ ہے۔

نام درجہ	تعداد طلبائے اردو	دیگر طلبہ	کیفیت
اول	۸۲	۴	
دوم	۴۰	۴	
سوم	۲۵	۶	
چہارم	۲۱	۹	
پنجم	۱۶	۳	
ششم	۲۱	۴۰	
ہفتم	۱۳	۲۹	
ہشتم	۵	۲۲	
میزان	۲۷۳	۱۱۷	

اس لیے التماس ہے کہ براہ کرم حسب احکام گورنمنٹ راجستھان وتعمیل قرارداد میٹنگ تاریخی ۲ ستمبر ۱۹۶۶ء زیر صدارت جناب والا ان طلبہ کی تعلیم کا انتظام کرایا جا کر ممنون فرمایا جائے اور اس اسکول کو اردو میڈیم اسکول قرار دلوایا جائے۔ امید کہ بعد اجرائے احکام جواب سے بھی مطلع فرمایا جائے گا۔

جے پور
(احترام الدین احمد شاغل جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو راجستھان)

صدر انجمن ترقی اردو احمد آباد کے انتقال پر تعزیتی جلسہ

انجمن ترقی اردو احمد آباد و صوبہ گجرات کے صدر و سابق ڈپٹی میئر جناب مصطفیٰ حسن قادری کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے مقامی انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام شہریوں کا ایک تعزیتی جلسہ پروفیسر ڈاکٹر چھوٹو بھائی نائک کی صدارت میں منعقد ہوا۔

جلسہ میں پروفیسر وارث علوی، سید صفدر حسین بخاری، محمد اسمٰعیل خالدی، عقیل احمد آبادی، اسمٰعیل منصوری و جناب صدر نے مرحوم کی سماجی و تعلیمی سرگرمیوں پر مفصل روشنی ڈالی آخر میں ایک تعزیتی قرارداد منظور کی گئی جس میں آپ کے انتقال پر ملال کو احمد آباد کے لیے ایک عظیم سانحہ قرار دیتے ہوئے گہرے رنج و الم کا اظہار کیا گیا اور پسماندگان سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے انھیں صبر کی تلقین کی گئی۔

(جاوید انصاری)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کی